

ایک پہیس کئے پر اتر گیا اور گاڑی دامیں بائیں ڈول رہی تھی۔ اگلی سیٹ پر پنڈت جی اور ان کی بیوی بیٹھے تھے اور پچھلی نشست پر ان کی دونوں لڑکیاں ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی چینیں مار رہی تھیں۔ پنڈت جی دونوں ہاتھوں سے راسیں ٹھیک رہے تھے مگر چنگاریاں اڑائی ناپیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ پنڈت جی کی پیڑی کھل کر ان کے گلے میں لٹکنے لگی تھی اور اب وہ بھی بچاؤ کی صدائیں بلند کرنے لگے تھے۔ ٹھیلا دونوں ہاتھ اور پر اٹھائے سڑک کے درمیان کھڑا تھا اور ہم سب اپنے اپنے ہتھیار سنجھا لے ہوئے ذرا دور ایک درخت کے نیچے جمع تھے۔ جو نبی گھوڑی نے کسی کور استر روکے دیکھا، اس نے رفتار اور تیز کر دی۔ ٹھیلا جھلائے عقاب کی طرح آگے جھپٹا اور اچھل کر گھوڑی کا دھانہ پکڑ لیا۔ گھوڑی الف ہو گئی اور زور سے ہنہنائی اور جھنجلا کر سر جھٹکا۔ ٹھیلا کی گرفت چھوٹ گئی اور سڑک کے نیچوں بیچ گرا۔ گھوڑی کا ایک سم اس کے ماتھے پر اور دوسرا چھاتی پر پڑا۔ پل بھر کو اس کی روشن آنکھیں اپنی پوری بے تابی سے چمکیں اور بند ہو گئیں۔ گھوڑی نے ایک مرتبہ پھر تیز ہو کر سنگین سموں سے چھاتی اور پیٹ کو کچل ڈالا۔ صدر اس کی ٹانگوں کے درمیان پڑا تھا۔ بکھی تھم گئی تھی اور پنڈت جی الجھا ہوا صافہ گلے سے علیحدہ کرتے ہوئے گاڑی سے اٹر رہے تھے۔ سڑک پر خون کی سُست رومندی آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ٹھیلا کے ماتھے پر خون تھا۔ گھٹے ہوئے سر پر خون تھا اور گھوڑی کے سموں پر خون تھا۔ پنڈت جی گاڑی کے پہلو میں کھڑے اپنی بیوی اور لڑکیوں کی طرف ویکھ دیکھ کر چلا رہے تھے۔ ”میرا سٹوڈنٹ ہے صدر جی۔ میرا سٹوڈنٹ۔ صدر میرا سٹوڈنٹ۔“

اور صدر گھبرائی ہوئی گھوڑی کے قدموں میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ہم سب اس کے ارد گرد اپنے اپنے ہتھیار سنجھا لے کھڑے تھے۔ ہاکی سنک میرے ہاتھوں سے پھسلی جا رہی تھی۔ میں نے اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے صدر کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس نے گویا مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نه تو بذدل ہے نہ کمینہ، ذرا مولوی ہے نا، اس لیے تشویش ہے۔ بس ہم مریں یا جیس تم اپنی کارروائی کیے جانا۔“

میں نے کارروائی کے لیے بازوؤں کو تولا توہا کی میرے ہاتھوں سے چھوٹ کرایے گئی جیسے صدر گرا تھا۔

اُجلے پھول

کیسی اُجلی چاندنی پھیلی ہے۔ کتنے پیارے پھول کھلے ہیں اور کیا لپکتا لہتا گیت ہے کہ اب ایل کی طرح اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔ یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس وقت میں اکیلی پھول چننے کیلئے آئی ہوں، اور جب ٹوکری بھر کر اندر لوٹوں گی تو اکیلے ہی بیٹھ کر انہیں گوندھوں گی۔ آپی سے تو اتنا بھی نہ ہو گا کہ سوئی میں دھاگہ ڈال کر مجھے دیتی جائے یا رنگ برنگی ڈوریں ہی بُتی رہے۔ میرا اس کا بہنا پا تو جنم سے ہی ختم تھا۔ آج سکھیا پا بھی ختم ہو گیا۔ پچھلے ہی سال کی توبات ہے۔ میں نے یہیں انہی پیڑوں سے ایسی ہی چاندنی رات کو کتنی ہی کلیاں توڑی تھیں۔ ساری رات آپی کے ساتھ بیٹھ کر کیسی کیسی لمبی لڑیاں گوندھی تھیں، بار بار اٹھ کر ان پر ٹھنڈے پانی کے چھیننے دیئے تھے اور ان ساری لڑیوں کو کیسے سلیقے سے تہہ کر کے ٹوکری میں رکھا تھا اور اس وقت جب میری باری آئی تو آپی نے مسکرا کر نال دیا اور آئینے کے آگے بیٹھ کر بڑے اطمینان سے بال کھولنے لگیں اور میں بے وقوف بچ کی طرح اتنی دیران کے پہلو میں کھڑی رہی کہ شاید ان کا ارادہ بدلت جائے لیکن انہوں نے میری موجودگی تک کا احساس نہ کیا اور آرام سے بال کھولے گئیں۔ اور اب میں اکیلی بالکل اکیلی یہاں پھول چننے آئی ہوں۔ پر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے بنگلہ کی بچلواری میں آپ ہی چوری کرنے آئی ہوں۔ چاند کی کتنی ہی پوری ادھوری کرنیں ایک ایک کلی کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہیں، اسے توڑو، اسے چنوا اور جب وہ کلیاں میری چٹکی میں آگر شاخ سے علیحدہ ہو جاتی ہیں تو وہی پوری ادھوری کرنیں سرگوشیاں کرتے ہوئے پیڑ کی جڑ سے جا لپٹتی ہیں۔ ہم نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ یہ لڑکی جوئی ہے، اسے منہ بند کلیوں اور نیم شلفتہ پھولوں کا آپ ہی علم ہے۔ یہ

اندھیرے اجالے میں یکساں ہاتھ صاف کر سکتی ہے۔ ہر شاخ کو جانتی ہے، پچانتی ہے۔ ہم نے کسی کو نہیں بتایا، کسی سے نہیں کہا اور پروائی چلتی ہے تو ایک ہی پیڑ کی شاخیں سر ہلاہلا کے کہتی ہیں۔ اچھا چھا!! نہیں نہیں اور گیت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ابا بیلوں کی طرح اوپر ہی اوپر چڑھتے جاتے ہیں۔

گرمیوں کی ایک ایسی ہی چاندرات کو آپی، آلامی اور میں یونیورسٹی میں آپی کا نتیجہ دیکھنے کے تھے۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی آپی کے پیٹ میں درد اٹھنے لگا تھا اور وہ پھانٹ کی بر جی کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ آلامی اور میں انہیں اسی طرح چھوڑ کر آہستہ آہستہ نوٹس بورڈ کے پاس پہنچی تھیں اور بسم اللہ پڑھ کر آپی کا روول نمبر دیکھنے لگی تھیں۔ روول نمبر فہرست میں موجود تھا اور آپی نے بڑی اچھی سینکڑہ ڈویژن پائی تھی۔ میں آلامی کو اسی طرح چھبھوڑ کر چھلا ٹکیں مارتی ہوئی پھانٹ کی طرف بھاگی اور آپی سے لپٹ گئی۔ میں نمبروں کی گھنیاں بجانے لگے تھے اور آپی نہیں نہیں کہے جاتی تھیں۔ آلامی کے کہنے پر آپی کو ذرا اعتبار آیا مگر یقین اس وقت ہوا جب اگلی صبح انہوں نے اپناروول نمبر اپنی آنکھوں سے اخبار میں دیکھ لیا۔ ڈیڈی دوڑے پر گئے ہوئے تھے لیکن آپی کا نتیجہ دیکھ کر پہلے ہی ڈاک بنگلے سے واپس لوٹ آئے اور آپی کے داخلے کے بارے میں مینگ ہونے لگی۔ ہم سب آپی کے میڈیا کل کالج میں داخلہ لینے پر زور دے رہے تھے اور آپی ایک ہی بات پر اڑی ہوئی تھیں کہ اب چاہے کچھ ہی ہو، میں آگے نہ پڑھوں گی۔ ایم-بی-بی-ایس کا نام سن کر تو وہ کانوں پر ہاتھ دھرتی تھیں کہ بی-ایس-سی کرنے کے بعد ایم-بی-بی-ایس میں داخلہ لینا بڑا ہی خجالت آمیز کام ہے۔ کہتی تھیں اس میں رسولی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ ڈاکٹر بننے کے بعد پریکش یا نوکری کے دوران میں اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ بی-ایس-سی، ایم-بی-بی-ایس ہوں تو لوگ سمجھیں گے کہ ایف-اے میں ہڑڑہ ڈویژن لی ہوگی۔ میڈیا کل کالج میں داخلہ نہ ملا ہوگا۔ اسی لیے بی-ایس-سی کیا گیا اور یہ بات ہے بھی ٹھیک۔ اگر ایف-ایس-سی میں میری فرشت نہ کہی، سینکڑہ ڈویژن ہی آ جاتی تو میں ضرور ڈاکٹر بنتی لیکن اب اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈیڈی نے لاکھ سمجھایا، خوشامد کی، قدرے تینی سے پیش آئے لیکن آپی

نے ایک نہ مانی! اور ڈیڈی واپس دورے پر چلے گئے۔ ان کی رواوگی کے بعد آلا جی بڑی ہی دبی زبان میں آپی کو دا خلے پر آمادہ کرتی رہیں مگر ان کی کنویں گ کا نتیجہ خاک بھی نہ تکلا! ایک شام چائے کے بعد جب آلا جی نے پھر درخواست کی اور آپی نے وہی جواب دیا تو آلا جی نے آپی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بڑے پیارے لمحے میں انگریزی میں پوچھا۔ ”میری پیاری بچی تمہیں کسی سے محبت تو نہیں؟“ آپی ہنس پڑیں اور آلا جی کا ہاتھ ٹھپٹھپا کر کہنے لگیں۔ ”جب ہو گی تو سب سے پہلے آپ ہی کو بتاؤں گی۔“

آلا جی بڑی ہی شفیق ماں تھیں۔ ہم سب انہیں آلا جی اس لیے کہتے تھے کہ ڈیڈی کے قیامِ لندن کے دوران میں ہم اپنی خالہ کے یہاں رہے۔ خالہ کے چھوٹے بچے چونکہ ہماری امی کو آلا جی کہتے تھے، اس لیے ہم بھی انہیں آلا جی کہنے لگے تھے۔ ہم تو ہم امی کے سب بھائی بھینیں انہیں اسی نام سے پکارنے لگے اور امی کا نام خاندان بھر میں مشہور ہو گیا۔ آلا جی اپنے بھائی بھنوں میں سب سے چھوٹی تھیں اور اپنے خاندان کی سب سے پہلی گریجوایٹ خاتون! ان کا بر تاؤ ہمارے ساتھ ہمیشہ وہ ستانہ رہا۔ نہ بھی کسی بات پر ٹوکا، نہ کسی قسم کی تکالیف ہونے دی۔ ہمارے ساتھ ہر قسم کے کھیلوں میں شرکت کی۔ ہر طرح کی پارٹیوں میں ہمارا ساتھ دیا اور کبھی محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ ہماری ماں ہیں اور ہمیں ان سے دب کر یا مارعوب ہو کر رہنا چاہیے۔ میرے ساتھ وہ زندگی میں صرف اس وقت سختی سے پیش آئیں جب میزک کے امتحان میں فیل ہو گئی تھی۔ انہوں نے میرا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر درشتی سے کہا۔ ”اگر روؤگی تو گھر سے نکال دوں گی اور زندگی بھر تمہاری شکل نہ دیکھوں گی۔“ میں خوفزدہ ہو گئی اور ان کے سامنے بظاہر بہتی کھلیتی رہی۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے سکول سے اٹھالیا اور گھر پر خود پڑھانے لگیں اور اس وقت تک میری جان نہ چھوڑی جب تک امتحان کا نتیجہ نہ تکل گیا۔ ان کے پڑھانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ یہی جی چاہتا کہ آلا جی سوال حل کرتی جائیں اور ہم دیکھتے رہیں۔ وہ نظمیں پڑھتی جائیں اور ہم سنتے رہیں۔

انجم بھائی نے ایم۔ اے کے فوراً بعد سنشرل ایکسائز میں نوکری کر لی اور وہ تمبا کو انسپکٹر ہو کر ہمارے یہاں آگئے۔ جب میں نے انہیں آخری مرتبہ دیکھا تھا تو وہ کانچ میں نئے نئے داخل ہو کر چھیاں گزارنے ہمارے پاس آئے تھے اور مجھے پسلیں بنا

بنا کر دیا کرتے تھے۔ پہلے بڑے سیلیے سے پنل کے ارد گرد چاؤ سے ایک دارہ بناتے، پھر اس چکر سے آگے بلید یوں چلاتے جیسے کشمیری کار یگر اخروٹ کی لکڑی پر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچان نہیں سلتا کہ چاقو سے تاشی گئی ہے یا پنل تراش سے۔ کہانی کہنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ جیسی چاہو جس فقرے سے کہو، کہانی شروع کر دیتے۔ بے تکان بولتے چلے جاتے۔ گویا امیر و خروشنہ لکھ رہے ہیں۔ جس کردار کو ایک مرتبہ پیچھے چھوڑ دیا، پلٹ کر اس کی سارشہ لی۔ جس مقصد کیلئے شہزادہ گھوڑے پر زین ڈال کر نکلتا، اس کو بھول بھال کر گلی ڈنڈا کھیلنے لگ جاتا اور آدمی رات کو چور دروازے سے گھر آکر چپ چاپ سو جاتا۔ ان کی کہانی ہمیشہ اس فقرے پر ختم ہوا کرتی کہ ”جب شہزادے نے شہزادی کو جنوں کی قید سے چھڑوا لیا اور اپنے اردوی کو فرشت کلاس کا کرایہ دے کر شہزادی کو اس کے دلیں بھجوادیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور بنسی خوشی اکیلا زندگی گزارنے لگا۔“

اب کے جوان بھائی آئے تو کچھ اور ہی طرح کے۔ جیسے مردانہ کپڑے ہیں اے ٹیکر ماشر ہوں۔ کچھ ٹیکر سے کچھ ماشر سے! پنل تراشنا تو ایک طرف وہ تو اپنی پرانی چال بھی بھول گئے تھے۔ چلتے تو ایسا لگتا جیسے ڈاکیہ چھیاں تقسیم کرنے جا رہا ہو۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور سب سے پہلے سوال جو میں نے ان سے کیا، وہ ان کی اسی چال کے بارے میں تھا۔ بھائی بھائی مسکرائے اور بوت اتارتے ہوئے بولے ”توبہ توبہ وہ بھی کوئی چال تھی، کوئی روشن تھی۔ بڑی ہتھیا ہوئی، بڑا پاپ کیا۔“ پھر میری طرف دیکھ کر آنکھیں نچاتے ہوئے بولے ”جب سے بدھ مت اختیار کیا ہے، اسی طرح چلنا شروع کر دیا ہے۔ اس سے داتا بھی خوش اور کیڑے مکوڑے بھی راضی“۔ پھر انہوں نے انگلی اور ڈاکار لینے کے انداز میں کہا ”آہنہا پر مودھ رہا۔“

یہ بات سن کر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ شکر ہے ابھی بھائی کی طبیعت نہیں بدی۔ اگر خدا نخواستہ اس کا بھی نزد ان ہو جاتا تو کس کی ہمت تھی جو انہیں راہ راست پر لاتا۔ وہ جس رو میں بہہ نکلتے، بس بہہ ہی جاتے۔ میں نے بڑی خوشامد دوں اور سما جتوں کے بعد ان کی چال ٹھیک کی۔ بیرے کو سخت تاکید کی کہ ہر صبح شیو کے لیے انہیں گرم ہانی پہنچایا کرے۔ ان کا سوٹ میں ہر روز باقاعدگی سے استری کرنے لگی اور ابھی بھائی

پھر پہلے سی پنسٹینی تراشنے لگے اور اگلے جیسی کہانیاں کہنے لگے ہر روز شام کو آلا جی، آپی۔ اور انہم بھائی اور میں لان میں کر سیاں ڈال کر حالات حاضرہ پر گراماً گرم بحثیں کیا کرتے۔ جب دلائل کمزور ہو جاتے تو ہم پچھم میں بولنے لگتے۔ انہم بھائی اپنی آواز کو پاٹ دار بنا کر ”میں کیسے مان لوں، میں کیسے مان لوں!“ کا اور دشروع کر دیتے۔ آلا جی اپنا ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھا کر کہتیں ”آہستہ بچو آہستہ۔ پہلے بات کرنے کا سلیقہ سیکھو، اس کے بعد بحث کرنا۔“ ڈیڈی گھر پر ہوتے تو وہ بھی اس مغلس میں ضرور شرکت کرتے۔ انہوں نے اپنے لڑکپن میں خلافت کا زمانہ دیکھا تھا، اس نے ان کے خیالات ہم سب سے مختلف تھے۔ آپی ہر ملک کے بازوئے شمشیر زن کی زواؤگے بڑھاتیں اور میں برلن ریڈی یو ایشن کی اردو تقریروں کا حوالہ دے کر اپنی ہانکے جاتی۔ انہم بھائی ہر حال میں میرا ساتھ دیتے اور بُدھہ ہونے کے باوجود ہٹلر کی تعریف میں قصیدے پڑھے جاتے۔ آلا جی مان تھیں، اس نے جنگ سے تنفر تھیں۔ انہم بھائی ہو امیں مُکابلنڈ کر کے کہتے۔ ”طارق ابن زیاد وہ وادہ۔ خالد بن ولید سجان اللہ“ اور آلا جی کو خاموش ہو جانا پڑتا۔ آپی انہم بھائی کی اس رنگ بدلتی پالیسی پر سخت برہم ہو کر مسکرانے لگتیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں پوری کھل جاتیں اور شرتی پتلياں ادھر ادھر یوں ڈولتیں جیسے دودھ کے کثورے پر نیل کے قطرے ہٹکو رے لے رہے ہوں اور میرا جی چاہتا کہ آپی کو گلے لگا کر ان کی آنکھیں چوم لوں۔ ان دیکھوں کی ایسی جوت تھی کہ کالے کے رو برو اور جگتی، خوشی میں اور لہکتی اور برہمی میں سارا چہرہ گلستان کر دیتی۔ ایک دن میں انہم بھائی اور آپی فلاش کھیل رہے تھے۔ پیسے پوانٹ کی بازی لگی ہوئی تھی اور بھائی ہمارے چلے جا رہے تھے۔ جیسیں خالی ہو جانے پر دھیلایا پوانٹ کی درخواست کی۔ ہم نے گتے کے ٹکڑے کاٹ کر دھیلے بنالیے اور کھیل شروع ہو گیا۔ خدا جانے ان کا غذی سکون پر انہم بھائی کو کیسی دسترس تھی کہ نہ صرف اپنی ہادری ہوئی رقم واپس لوٹاں بلکہ ہمارے میے بھی جیتنے شروع کر دیئے۔ آپی کے سارے پیے ختم ہو گئے تو بھائی نے کہا۔ ”بس تائیں تائیں فش!“ آپی نے کہا۔ ”توبہ کرو، ابھی تو میرے بکس میں تین روپے پڑے ہیں۔“ انہم بھائی نے سر جھنک کر اور ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ ”تو لا و پھر دیر کس بات کی ہے!“ آپی روپے لے آئیں تو بازی پھر شروع ہو گئی۔ بھائی کی قسمت یا در تھی، انہوں نے وہ بھی جیت لیے اور تاش کو ڈینا

میں بند کرتے ہوئے کہا۔ ”بس طلوبہار گئیں؟“
آپی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”واہ انھی میں کیوں! ہار گیا سرکار کا سکھ۔ میرا کیا
گیا بھلا؟“

بھائی نے کہا۔ ”کوئی بھی ہارا، ہار گیا۔ طلو! میرا مطلب تھا یہ آثار ذرا اچھے
نہیں ہوتے۔“

آپی نے کچھ کہنا چاہا اور وہ چپ ہو گئیں اور ان کی آنکھوں کے دیئے کچھ
ایسے جگلگائے جیسے ان میں تسل کی بجائے شہنم پڑی ہو! اور میرا جی خدا جانے کیوں چاہا کہ
ان آنکھوں کو روٹتے ہوئے بھی دیکھوں۔

یا تو انہم بھائی سے میری بچپنے کی دوستی تھی یا اب وہ ایسے جان بچانے لگے جیسے
بھی چھوٹ کی بیماری ہو۔ کسی نہ کسی بہانے مجھے کام پر لگائے رکھتے اور آپی سے باتیں
کرتے رہتے۔ پتہ نہیں آپی سے گئیں ہاں کہانک کر ان کا جی کیوں نہ بھرتا تھا۔ میرے
لیے گھڑی ہوئی ساری کہانیاں انہیں سنائے جاتے۔ آپی بظاہر طرح دیئے جاتیں، پران
کادھیاں کہانی میں ہوتا اور جب بھائی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہتے ”اوہ مجھے تمبا کو کا ایک
گودام چیک کرنے جانا ہے۔“ تو آپی آہستہ سے کہتیں۔ ”کوئی ضرورت نہیں، چوہے
نہیں کھاجاتے آپ کا تمبا کو، کل چیک کر لینا۔“

”کل!“ بھیا حیران ہو کر کہتے۔ ”کل کا کیا بھروسہ، آئے آئے نہ۔“

اور آپی بات کاٹ کر کہتیں۔ ”نہ آئے تو نہ سہی۔“

بھائی نہ س کر کہتے۔ ”طلو حضور! یہ نو کری ہے جا گیرداری نہیں۔“

آپی جوت جگا کر کہتیں۔ ”تو جاؤ پھر۔“

اور انہم بھائی سنجیدگی سے کہتے۔ ”کل سہی، کل کون سی دُور ہے۔“

پھر وہ کل پورے ایک بفتے کے بعد آتی۔

آپی بچاری تھیں تو ادب کی دلدادہ لیکن ڈیڈی نے زبردستی انہیں
الیف۔ ایسی میڈیا کل لے دیا تھا۔ گریجوائیٹ ہونے کے بعد جب انہوں نے آگے
پڑھنے سے انکار کر دیا تو ادب کے معاملے میں جی بھر کے حرستیں نکالیں۔ لاہبری سے
ایسی ایسی کتابیں لاتیں کہ انہیں دیکھ کر طبیعت اش کرنے لگتی۔ کچھ پرانی نولکشوری

کتابیں، کچھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کی اردو کی کتابیں جنہیں میں ایک عرصہ تک عربی کی کتابیں سمجھتی رہی اور کچھ ایسے قصے جن کے پبلشر تو ایک طرف، مصنفوں کے نام بھی معلوم نہ تھے۔ ان کے بعد اچانک ایک دن جو پنجابی زبان کے مطالعے کا بھوت سوار ہوا تو جلتی دوپہر میں نوکر کو "اصلی تے وڈی ہیر" لانے کے لیے بازار روانہ کر دیا اور جب تک وہ کمخت کتاب آنہیں گئی، دو دو منٹ بعد پھاٹک کے چکر ہوتے زہے اور جب ایک مرتبہ اس تحریر کو روانی سے پڑھنے کا محوارہ ہو گیا تو اسی بنگلے میں قدم قدم پر پنجابی کے قصے اور گیتوں، بولیوں کی کتابیں یوں پڑی ملتی تھیں جیسے سید وارث شاہ بمعہ اپنے کتب خانے کے ہمارے یہاں مہمان ہوں۔

شام کو حالات حاضرہ پر تبصرہ مفقود ہو گیا اور اس کی بجائے اردو، انگریزی اور پنجابی کے ہم معنی اشعار سنائے جانے لگے۔ آلاجی کو انگریزی شاعری پر بڑا عبور تھا۔ وہ ہر شعر کے مقابلے میں تقریباً ویسا ہی انگریزی کا نکڑا ڈھونڈ نکالتیں اور آپی ان کا امتحان لینے کے لیے پنجابی رسیلے گیت اور انوکھے چٹے سنائے جاتیں۔ دو تین دن تک یہ محفل یونہی گرم ہوتی رہی اور اس کے بعد اجمجم بھائی کی رائے سے گھر "مجلسِ اہل قلم" کی بنیاد رکھ دی گئی۔ سیکرٹری شپ کا قرعہ میرے نام پڑا اور کارروائی لکھنے کے لیے ایک خوبصورت سی کاپی میرے حوالے کر دی گئی۔ سب سے پہلی مجلس کی صدارت آلاجی نے کی۔ آپی نے ایک افسانہ "زندانی تقدیر" پڑھا جس پر بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ اجمجم بھائی اقبال کے اشعار پڑھ پڑھ کر یہ ثابت کر رہے تھے کہ انسان زندانی تقدیر نہیں بلکہ تقدیر یزاداں ہے اور قسمت، تقدیر، مقدر سب بے معنی چیزیں اور بے ہودہ خیال ہیں۔ صاحب صدر نے اکثر سخت الفاظ پر اجمجم بھائی کو نوکا اور وہ معدورت کرتے ہوئے اپنی تقدیر جھاڑتے رہے۔ چونکہ تبصرے پر غیر معمولی وقت صرف ہو گیا، اس لیے میرے مضمون کی باری نہ آئی اور صاحب صدر کی مختصر سی تقدیر اور طویل دعاوں کے بعد مجلس برخاست ہو گئی۔

انہی دنوں کی بات ہے گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارے ہاں للاماموں آگیا۔ یہ آلاجی کا رشتہ کا بھائی تھا اور آپی سے دو سال چھوٹا۔ ہم اسے للاماموں اس لیے کہتے تھے کہ ایک تو اس کا رنگ کہیا جی ایسا تھا۔ دوسرے بی۔ اے کاظم علم ہونے کے باوجود بڑا

میاں آدمی تھا۔ چالیس چالیس مضمون کی آزاد نظمیں رقم کرتا اور ان کے نیچے ”باتی پھر“ لکھ دیتا۔ اس کی آمد سے ہماری مجلس میں جان پڑ گئی۔ للاموں نظم سنارہا ہے اور ہم سب برواشت کیے جاتے ہیں۔ تبصرے کی باری آتی ہے تو سنبھل کر بیٹھ جاتا اور تنقید کرنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں یوں ڈالتا کہ بچارا چوکڑی بھول جاتا۔ ایک مرتبہ ہم نے اسے صدر بھی بنایا لیکن اس نے آغاز مجلس کو انجام مجلس بنادیا۔ سارے بنگلے کی بیان روش ہو گئیں اور ماموں کا شکریہ صدارت انجام پذیر نہ ہوا۔ ہم نے ان پر لیٹ شو کی پینٹیٹی لگادی۔ رات کے وقت ہم سب اپنے اپنے جو تے بغلوں میں دبائے آلاجی اور ڈیڈی کو سوتا چھوڑ کر سینما چلے گئے۔ للاموں نے فلم دکھائی، آس کریم کھلانی اور انجم بھائی نے پان کا خرچ برواشت کیا۔ واپسی پر ہم سب اس بنگلے کا جنگلہ پھاندنے والے تھے کہ پلوٹو جاگ اٹھا اور اٹھائی گیروں کے اس گروہ کو دیکھ کر بھونکنے لگا۔ ادھر پلوٹو اپنی پوری قوت سے بڑھ کرتا، ادھر انجم بھائی ہاتھ سر پر رکھ کر کہتے ”و علیکم بُوْبُو“ میں اور آپی ایڑیاں اٹھا اٹھا کر ان کے منہ پر ہاتھ دھرتیں لیکن وہ ہمارے ہاتھ جھٹک کر ”و علیکم بُوْبُو، و علیکم بُوْبُو“ کہتے جاتے۔ نوکر چاکر آلاجی، ڈیڈی سب جاگ اٹھے اور ہماری چوری کپڑی گئی۔ اگلی صبح آلاجی نے مجھے اور آپی کو بلا کر صرف اسی قدر کہا۔ ”تم مشرق کی بیٹیاں ہو، یورپ کی گلیمر گرز نہیں ہو اور مشرقی بیٹیاں بڑوں سے پوچھہ بنا کہیں نہیں جاتیں۔“ پھر انہوں نے ہمیں اپنے ساتھ لپٹالیا اور ہولے سے کہا۔ ”برانہ مانا، میں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔“ اس کے بعد آپی کا ہاتھ کپڑا کر اندر لے گئیں۔ پتہ نہیں انہوں نے آلاجی سے کیا کہا ہو گا لیکن مجھے بڑی مدت کا ایک منظر رہ کریا اور ہاتھا۔ جب آلاجی نے آپی کے دونوں ہاتھ کپڑا کر کہا تھا۔ ”میری بچی! تمہیں کسی سے محبت تو نہیں؟“ شاید انہیں یہی بات بتانے کے لیے اندر لے گئی ہوں مگر اس دن آپی کا چہرہ بنشش ہونے کے بجائے کچھ مر جھاسا گیا۔ انجم بھائی کے آلاجی سے ہمارے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں۔ بے معنی اور مہمل سی جو کٹھی ہو ہو کر تلخ سے تلخ تر ہو گئی تھیں۔ شاید آلاجی نے وہ ساری باتیں ایک ایک کر کے آپی سے کہی ہوں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا ہو۔ ”اب بتاؤ رانی! میں کیا کروں؟ تم ہی کہو ٹلوویہ کیوں کر ہو؟“

شاید یہ باتیں نہ بھی ہوئی ہوں، پر آپی کا چھرہ دن بھرا تراہا اور انہوں نے ہم میں سے کسی کے ساتھ کھل کر بات نہ کی۔

پھر ایک مرتبہ لاما موس کی صدارت میں مجلس منعقد ہوئی۔ ڈیڈی دورے سے آئے ہوئے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ اہل قلم نہیں تھے۔ ہم نے انہیں ”ائیش کیس“ بنانے کے محفل میں بیٹھنے کی اجازت دیدی۔ انجمن بھائی نے ایک افسانہ لکھا تھا۔ افسانہ تو خیر ان کی کہانیوں کی طرح بے سر و پتا تھا لیکن زبان بڑی پیاری تھی۔ بھائی فارسی کے آترز تھے اور انہوں نے ایسی پیاری ترکیبوں اور استعاروں سے عبارت سجاوی تھی کہ سب کو مزا آگیا۔ ڈیڈی ایک ایک فقرے پر سرد ہنتے اور خوب! بہت خوب! کہہ کر داد دیتے جاتے۔ افسانہ ختم ہو چکا تو آپی نے ہولے سے کھنکار کر کہا۔ ”صاحب صدر مجھے اس افسانے کی زبان کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔“ ہم سب حیران ہو کر آپی کا منہ تنکے لگے۔ لاما موس نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ”ارشاد!“

آپی نے کہا۔ ”بظاہر یہ افسانہ اردو زبان میں لکھا گیا ہے لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے۔ یہ فارسی زبان کا بہت ہی بڑا ذخیرہ الفاظ ہے۔ حسن اتفاق سے اس میں چند مصادر اردو کے بھی آگئے ہیں جنہوں نے سامعین کو یہ سوچنے کا موقع نہیں دیا کہ کہانی غیر ملکی زبان میں لکھی گئی ہے۔“

لاما موس نے بات کاٹ کر کہا۔ ”محترمہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری زبان فارسی اور دیگر بولیوں کے تال میں سے بھی ہے۔“

آپی نے اسی انداز میں کہا۔ ”صاحب صدر اس سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن یہاں تو دیکی بولی کی پٹ سرے سے نہیں ملتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ محترم افسانہ نگار نے ہم لوگوں پر اپنی علیت اور زبان دانی کا سکم بٹھانے کے لیے یہ کاوش کی ہے۔ افسانہ ایسی زبان کا ہرگز متحمل نہیں ہوتا۔ ہاں فنِ خطابت کے تقاضوں۔“

اب کے انجمن بھائی نے ٹوک کر کہا۔ ”صاحب صدر کہنے والی بات کیسی ہی خیال انگلیز کیوں نہ ہو، جب تک اعتماد اور وثوق سے نہ کہی جائے گی، وہ قاری یا سامع کو کبھی بھی متاثر نہیں کر سکتی۔“

آپی نے مسکرا کر کہا۔ ”صاحب صدر اگر اعتماد اور وثوق انگریزی میں،

فرانسیسی اور اردو میں فارسی الفاظ کے استعمال کرنے کا نام ہے تو شاید محترم افسانہ نگار ٹھیک کہتے ہوں لیکن اگر ان کی مراد اسلوب اور اظہار سے ہے تو میں یہ عرض کیے بغیر نہ رہوں گی کہ انہوں نے بڑے ہی نپائیدار سحر سے مسحور کرنے کی کوشش کی ہے۔“

ڈیڈی نے انجمن بھائی کے تیپور دیکھ کر کہا۔ ”طلوبیناً اگر۔۔۔“

اور میں نے بحیثیت سیکرٹری ڈیڈی کو منتبہ کیا کہ ”یہاں کوئی براہ راست کسی سے گفتگو کرنے کا مجاز نہیں، آپ کو جو کچھ کہنا ہے صدر صاحب سے مخاطب کر کے کہیے۔“

ڈیڈی نے ”آئی ایم سوری! آئی ایم سوری!“ کہتے ہوئے صدر کو مخاطب کیا اور کہا۔ ”صاحب صدر میرا خیال ہے کہ وقت کافی ہو چکا ہے اس لیے مجلس برخاست کر دی جائے۔“

مجلس برخاست ہو چکی تو انجمن بھائی سید ہے اپنے کمرے میں چلے گئے اور مجلس کے بعد جو باقی میں ہوا کرتی تھیں، وہ نہ ہو سکیں۔

اگلے دن ڈیڈی اور آلاجی کو کسی نے دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا۔ آپی ڈرائیکٹ روم کی نئی تشکیل میں مصروف تھیں اور میں فرمائشی پروگرام سن رہی تھی کہ اچانک مجھے انجمن بھائی کا خیال آیا۔ انہوں نے کسی دوست کے ہاں سے کیمرا لانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں ریڈیو کو اسی طرح کھلا چھوڑ کر مختلف کروں میں سے ہوتی ہوئی بھائی کے کمرے کے پاس پہنچی تو مجھے آپی کی آواز سنائی دی۔ میں نے پردے کے ساتھ لگ کر اندر جھانک کر دیکھا۔ انجمن بھائی قالین پر بیٹھے سندھے سینڈر ڈسے تصویریں کاٹ کاٹ کر ایک بڑے سے رجڑ پر چکا رہے تھے۔ آپی ان کے پیچے کھڑی تھیں اور بھائی کے کندھے کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے بار بار چھو کر کہہ رہی تھیں۔ ”بولتے کیوں نہیں۔۔۔ بولتے کیوں نہیں؟“

اور انجمن بھائی بڑے انہاک سے قینچی چلا رہے تھے اور ایسے بیٹھے تھے جیسے کسی کی موجودگی کا واقعی ان کو احساس نہ ہو۔ آپی نے ان کے سہرے سہرے بالوں کو اپنی مٹھیوں میں پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دیئے اور پھر کہا۔ ”بولتے کیوں نہیں۔۔۔ بتاؤ نا، بولتے کیوں نہیں؟“

انجم بھائی اس پر بھی نہ بولے تو آپی نے اسی طرح بال پکڑے اپنے دونوں زانوں ان کے کندھوں پر رکھ دیئے۔ ایک ثانیے کے لیے وزن تولا اور پھر ہلکے ہلکے جھونٹنے لے کر ہو لے ہو لے گا نہ لگیں۔

ہتھ جوڑا پکھیاں دا

نالے ساؤ اماہی لگدا نالے چانن اکھیاں دا

جب انہوں نے اسی طرح ہلورے دیتے ہوئے پانچویں یا چھٹی مرتبہ یہی شعر پڑھا تو انجم بھائی نے قیچی زمین پر رکھ کر کہا۔ ”خدا کی قسم تم بہت وزنی ہو۔“ آپی نے جھوپلا بند کر کے کہا ”کھانا کھاتی ہوں، کوئی تمباکو سونگھ کر نہیں جیتی۔“ انجم بھائی نے کہا۔ ”کھانا تو خیر ہم بھی کھاتے ہیں لیکن ایسے بوجھ تم پر نہ لاتے ہوں گے۔“

آپی نہیں اور زور زور سے ہلورے لینے لگیں۔ بھائی نے ہاتھ بڑھا کر اسے بالوں سے پکڑا اور نیچے کھینچتے ہوئے بولے۔ ”آپی کی بچی مجھے استری کرڈا لا، نیچے اُتر۔“ اور پھر انہیں ہلکا سا جھٹکا دیا۔ آپی بوری کی طرح نیچے گریں اور گرتے ہی پٹ پٹ پٹ انجم بھائی کی ران پر پڑے کے لئے کلتے ہی ہاتھ چلا دیئے اور پھر وہیں سر رکھ کر لیٹ گئیں۔ انجم بھائی نے قیچی پوری طرح کھول کر آپی کی ناک دونوں پھلوں کے درمیان آہستہ سے پکڑ لی اور کہنے لگے ” یہ تمیونا نیوں جیسی ناک لیے پھرتی ہونا، ایک منٹ میں سون چڑی کی طرح اڑ سکتی ہے۔“

آپی نے پوپٹوں کی سی آواز نکال کر کہا۔ ”کتنے خلغم کی بات ہے کہ ایک قبوع صوغت عوغت کی ناک اُغا دی جائے۔“

”قبول صورت۔“ انجم بھائی نے کہا۔ ”ذرا اپنی صورت تو دیکھو آئیئے میں۔“ اگر پوپٹوں کی ایک جنبش پر کوہ قاف کی ساری مخلوق قربان نہ ہو جائے تو سہی۔“

آپی نے تک کر کہا۔ ”اوئے پوپٹوں کے بچے! ہمارے سامنے غلط محاورے استعمال کرتا ہے! ہم۔ ہم۔“ اور پھر آپی خود ہی ٹھللکھلا کر ہنس پڑیں۔

انجم بھائی نے اپنی تکریہ بنی ہوئی ران زور سے ہلا کر کہا۔ ”گورو جی پنسری تو اٹھاؤ۔“

اور گورو جی نے ہنس کر کہا۔ ”انھاتے ہیں برخوردار، گھبراتے کیوں ہو؟“
برخوردار نے کہا۔ ”سرکار ذرا اجلدی کیجئے، مانگ سو گئی ہے اگر۔“

آپی نے ٹوک کر کہا۔ ”سو نے دو، سوتوں کو جگانا بڑا پاپ ہے۔“

انجم بھائی نے سر جھکا کر بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ ”آلابھی کیا کہتی تھیں طلو؟“
”پچھے بھی نہیں۔“ آپی نے کہا۔

”پچھے بھی نہیں کا کیا مطلب؟“ انجم بھائی نے کہا۔ ”پچھے تو کہتی ہوں گی۔“

”تیا بایا کی بابت کہہ رہی تھیں انجھی۔ کہتی تھیں وہ بڑے سنگدل ہیں۔ ہمارے ساتھ تو بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ ایسی بڑی بات کے لیے خود کیوں کر پیش قدمی کریں گے؟“

انجم بھائی سوچ میں پڑ گئے تو آپی انھوں کے بیٹھ گئیں اور ان کی شہوڑی اور پر اٹھا کر کہنے لگیں۔

و گدی اے راوی ماہی وے وچ اک ٹھل کائی دا ڈھولا

میں نہ جمدی ماہی وے تو کی کر ویائی دا ڈھولا؟

انجم بھائی نے پتہ نہیں کیا کہنے کے لیے منہ کھولا تو آپی نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ”نہ نہ میں اگلا بول نہ سنوں گی۔ بس!“

بھائی نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور آپی کی طرف بڑھا دیا۔ آپی ہر سطر پڑھنے کے بعد انجم بھائی کے چہرے کی طرف دیکھتیں پھر آگے پڑھنے لگتیں۔ ان کی آنکھوں کا چاندن ان کے سامنے تھا اور دو دھیا کٹوروں میں تیل کے دھبے پھیلتے جا رہے تھے۔ دیوں کی جوت کم ہوتی جا رہی تھی اور چنگا بیاں بھوبل کی تھوں تلبے دبی جائی تھیں۔ پتہ نہیں وہ کس کا خط تھا۔ انجم بھائی کا یا ان کے باکا جس کسی کا بھی تھا، اس نے آپی کے وجود سے سارے گیت چاٹ لیے۔ ان کی آواز سے کو ملتا نوچ لی اور آپی جیسے کانج کی آپی بن کر رہ گئیں۔

اس کے بعد ہماری مجلس کی ایک اور مینگ ہوئی اور یہ آخری نشست تھی۔ مجلس کو انجم بھائی اور آپی کے کہنے کے مطابق ختم کر دیا گیا۔ اس آخری نشست کی صدارت آلابھی نے کی۔ اس میں آپی نے ایک افسانہ ”چانن اکھیاں دا“ پڑھا۔ یہ بڑی

کرب ناک کہانی تھی۔ ایک ایک فترے پر خار چھوڑ کشاد کا زخم لگتا تھا۔ اس پر پڑھنے والے کی آواز لاما موس جیسا آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اختتام پر آلامی نے کسی کو بحث کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے بڑے دھمے انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”مجھے تم لوگوں کی اس مجلس میں کئی بار شرکت کرنے کا موقع ملا ہے اور ہر مرتبہ میں دل میں دکھ لے کر یہاں سے گئی ہوں۔ آپ کے افسانوں میں خاص طور پر طلعت کی کہانیوں میں درد اور مايوسی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کی نظموں میں ناکامی اور تنگ دامانی کے سوا اور کسی چیز کی جھلک نظر نہیں آتی۔ اس دنیا میں پہلے کیا کم دکھ ہیں جو تم لوگ کرب ناک کہانیاں اور درد انگیز قصے لکھ کر ان میں مزید اضافہ کرتے رہتے ہو۔ ایسی باتیں کرنے سے حوصلے پست ہو جاتے ہیں، جی چھوٹ جاتے ہیں اور عمل کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ آپ نوجوان ہیں، خدا نے آپ کو اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے بڑی طاقت دی ہے۔ اسے کام میں لایے۔ تقدیر آپ سے قوی تر ہے۔ مقدر کا لکھا ان مست نہیں ہوتا۔ تقدیر پریں بدلتی جاتی رہی ہیں اور بدلتی جاتی رہیں گی۔ ہمیں بنشاشت کی ضرورت ہے۔ صحت مندانہ پیش قدی کی حاجت ہے اور کھلاڑیوں جیسی روح کی احتیاج ہے۔ آپ لوگ نوجوان ہیں، صحت مند ہیں۔ اپنے اپنے شانوں پر سوچنے سمجھنے والا سر رکھتے ہیں۔ پھر آپ دکھوں کی اندر گھپاؤں میں جھانک جھانک کر کیوں دیکھتے ہیں۔ خوشنما لکھیوں کی باشیں سمجھتے۔ چاند کی کروں سے گیت مرتب سمجھتے۔ افقی ستارے کی طرف دوستی کا باتھ بڑھائیے۔ ان خوبصوروں سے دامن بسائے جو اجلے پھولوں سے پاکیزگی اور تبسم لے کر آتی ہیں اور اگر ایسا نہ ہو گا تو زندگی بے حد تلخ فرض ہو کے روز جائے گی اور مستقبل حال بننے سے پہلے آسیب زدہ خراجہ نظر آئے گا۔“

شاید وہ ابھی کچھ اور کہتیں لیکن انجم بھائی نے انہیں بیچ ہی میں ٹوک دیا اور کہنے لگے۔ ”آلامی ٹھیک کہتی ہیں۔ ہم ہی تو ہیں جو دکھوں کے جٹاکل ناریل کو توڑ کر اس میں سے جان بخش پانی حاصل کرتے ہیں۔ وہ ہمیں تو ہیں جنہوں نے زندگی کو دلاؤ زین بنانے کے لیے سمندر پھاڑا لے۔ پھالوں سے دریا بھائے اور خارزار وادیوں کو تختیہ گل بنادیا۔ مجھے چاند سے عشق ہے۔ ان پھولوں سے عشق ہے جو چاندنی میں کھلتے

ہیں اور ان خوبیوں کا سودا ہے جو ہمیں زندگی کا احساس دلاتی ہیں۔“
آلابجی نے ہولے سے کہا۔ ”صاحب افسانہ کو اپنی کہانی موضوع یا نظریے
کی وضاحت کے لیے کچھ کہنا ہے؟“

آپی نے دوپٹہ سنجاتے ہوئے کہا۔ ”اگر میرے شانوں پر واقعی سوچنے
سمجھے والا سر ہے تو مجھے کچھ نہیں کہنا۔“

محفل درہم ہو گئی اور میں اپنی کاپی لے کر آخری کارروائی لکھنے کے لیے بیٹھ
گئی تو آپی نے انجمن بھائی کا کوٹ پکڑ کر کہا۔ ”جو کچھ تم کہہ رہے تھے، کیا واقعی اس سے
تمہارا مطلب بھی یہی تھا؟“

”بالکل۔“ انجمن بھیانے اعتماد سے کہا۔ پھر وہ ذرا رکے اور پیار بھرے لبھ میں
کہنے لگے۔ ”آخر ہم کیوں نہ پھولوں، خوبیوں اور کرنوں کی باتیں کریں۔ کیوں نہ
خوشنگوار مستقبل کے تذکرے کریں۔“

آپی نے کہا۔ ”ہم کیوں نہ بھی باتیں کریں، کیوں نہ وہی کریں جو ہوتا ہے۔ جو
ہونے والا ہے اور جو ہوا تھا۔“

انجمن بھائی نے کہا۔ ”اچھی اچھی باتیں سوچنے سے اچھے اچھے کام آپ سے
آپ ہو جایا کرتے ہیں۔“ پھر انہوں نے آپی کا کندھا تھپٹھپا کر کہا۔ ”تم نہیں جانتیں
طلو، مجھے کلیوں اور کرنوں سے کتنا پیار ہے۔ اتنا پیار شاید مجھے تم سے بھی نہ ہو۔“ پھر
انہوں نے میری طرف دیکھا اور آپی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں باہر لے
گئے۔

تمبا کو انپکڑی تو خیر تفریحی نوکری تھی۔ اسے چھوڑ چھاڑ کر انجمن بھائی نے
فوج میں کیش لے لیا۔ اس کی خبر نہ ہم کو ملی، نہ ان کے گھر والوں کو پورے پندرہ میں
دن بعد ملٹری اکیڈمی سے ان کا خط آپی کے نام آیا تو پتہ چلا کہ صاحزادے کے بڑے
ٹائٹھ ہیں۔ ٹریننگ کے بعد ابھی لیفٹینٹ کے عہدے پر ہیں۔ کسی چھاؤنی میں تھے کہ
آفیسروں سے کہہ سن کر برما فرنٹ پر جانے کا حکم حاصل کر لیا۔ اس کا علم میرے اور
آپی کے سوا کسی اور کوئی تھا جس دن ہمارے شہر سے گزرتا تھا، میں اور آپی اسٹیشن پر
گئیں۔ وردی پہنے، شیر گھی سی ٹوپی رکھ۔ اپنے ڈبے کے باہر کھڑے سگر بیٹ پر رہے

تھے۔ مجھے اپنے ساتھ یوں لپٹا لیا جیسے میں ان سے پہل تر شوانے آئی تھی۔ نہ کر کہنے لگے ”ڈر ا ٹلو کامنہ تو دیکھو، ایسی وہی لڑکی میں نے اپنی زندگی میں کوئی نہیں دیکھی۔ ایسی کھڑی ہے گویا میراجنازہ اٹھنے والا ہے“

میں نے جل کر کہا۔ یہ کیا بکواس ہے۔ اکیڈمی میں ایسی ہی باتیں سکھائی جاتی ہیں کیا؟ ”اس سے بھی بڑھ کر۔“ وہ پھر نہیں اور میں خاموش ہو گئی۔

ابجم بھائی نے آپی کے کندھے پر ہولے سے ہاتھ رکھا اور چکار کر کہنے لگے۔ ”میں نے ہمت کبھی نہیں ہاری اور میں چاہتا ہوں، میرے دوست بھی اعتماد کرنا یکچیں۔ اگر تمہیں مجھ پر اور اتنے آپ پر اعتماد ہے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب میں تمباکو انپکٹر تھا تو ذرا سماز تھا لیکن اب میں فولاد کی طرح مضبوط ہو گیا ہوں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ زندگی اور موت دونوں میرے قبضے میں آگئی ہیں۔ فرنٹ پر پہنچتے ہی میں ایسا کو لکھوں گا۔ پھر دیکھوں گا، وہ کیسے انکار کرتے ہیں۔“ آپا کی آنکھیں ذرا دیر کے لیے چمکیں اور پھر وہ پلیٹ فارم پر نگاہیں گاڑ کر کسی گہری سوچ میں مستقر ہو گئیں۔

گاڑی چلنے لگی تو ابجم بھیتیانے کہا۔ ”ٹلو دا من کیسا ہی کیوں نہ ہو، انہیں کلیوں سے سجانا تمہارا کام ہے۔ مقدر (اگر کوئی چیز مقدر ہے تو) کیسا بھی تاریک کیوں نہ ہو، ہمت عالی سے منور کیا جا سکتا ہے۔ چاند نکلتا ہے تو اس کی کریں بلا قیمت میر آتی ہیں لیکن انہیں مہیا کرنا اور سنہرہ مستقبل وضع کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔“

گاڑی چلنے لگی، وہ پا کداں پر کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے ”تمہیں حاصل کرنے کے لیے میرے جو قدم اٹھیں گے، مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔ میں ایک دن تمہیں لینے کے لیے آؤں گا۔ خواہ میری راہ میں جہنم ہی کیوں نہ حاکل ہو جائے۔“

گاڑی تیز ہوتی جا رہی تھی اور ہماری رفتار سُست ہو رہی تھی۔ ابجم بھیا کا قوی ہاتھ فضا میں لہرا رہا تھا اور میں ویسے ہی تیزی کے ساتھ اپنا بازو ہلا ہلا کر جواب دیئے جاتی تھی۔ آپی انجن کی طرف پیٹھ مونٹے اشیشن کی چھت کو گھور رہی تھیں۔ جب ہم اشیشن سے باہر نکلنے لگیں تو آپا نے آہستہ سے کہا۔ ”نشرو تجھے بھی انجی اچھا لگتا ہے؟“ ”اچھا۔“ میں آپی کے ساتھ لپٹ گئی۔ ”انہی کی وجہ سے تو تم مجھے اتنی پیاری لگتی ہو۔“

اجم بھائی کے ابا جی کی پنچھن ہو گئی اور وہ چند دنوں کے لیے ہمارے یہاں آئے۔ ڈیڈی سے کچھ باتیں ہوتی رہیں اور پھر انہوں نے تجارت شروع کر دی۔ ڈیڈی کی کوششوں سے انہیں ایک بنگلہ بھی مل گیا اور ان کا سارا کتبہ یہیں آگیا۔ آلا جی ڈیڈی کے ساتھ کبھی کھاران کے یہاں جاتیں۔ پرانی تلمذیاں معدوم ہوتی گئیں اور دنوں گھر انوں کے تعلقات کسی حد تک اپنے ہو گئے۔ اس اثناء میں اجم بھائی نے اپنے ابا کو ضرور لکھا ہو گا۔ پہلے تو تایا جی نے لوگوں کے ذریعے آپی کے رشتے کا یوں نبی سا اظہار کیا لیکن ایک دن تائی جی کو ساتھ لے کر خود آپنے اپنے آپی کے رشتے کی درخواست کی، منگنی ہو گئی۔ آلا جی اس تقریب پر اس قدر خوش تھیں کہ میں نے اس سے پہلے انہیں کبھی ایسا نہ دیکھا تھا۔ معمولی رسم کی ادائیگی کے بعد میں نے آپی کو بازوؤں میں لے کر کہا۔ ”دیکھا آپی ایسے ہیں اجم بھائی، تم خواخواہ اپنے نظریات لیے پھرتی ہیں۔ آخر تم ہار گئیں نا۔“

آپی نے مسکرا کر کہا۔ ”میں کیا ہار گئی، ہار گئے تو نظریات ہار گئے۔“

میں نے چمک کر کہا۔ ”بھلا آپ سے کس نے کہا تھا کہ ہارنے والے نظریات کو اپنا میں۔“

اس پر آپی خاموش ہو گئیں۔

دو سال کا عرصہ پلک جھپکنے میں بیت گیا۔ اجم بھائی ہر ہفتہ باقاعدگی سے خط لکھتے اور آپی ان کا جواب دیتی رہیں۔ آخر بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد بھائی کو چھٹی ملی اور وہ یہاں آنے کے لیے روانہ ہوئے۔ آپی کے دل میں خوشی کے کیسے کیسے سمندر رہا تھیں مار رہے تھے۔ اس کی کیفیت ان کے چہرے سے عیاں تھی لیکن آپا بھی ایک ہی کمینی تھیں، کبھی زبان سے اظہار نہ کیا۔ میں نے ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ان سے وہ تمام چشم دید و اتعات بیان کیے جو میں نے چھپ چھپا کر دیکھے تھے اور جس کا علم نہ آپی کو تھا، نہ اجم بھائی کو لیکن آپی اپنے دل کی بات کبھی زبان پر نہ لائیں۔

جس صبح اجم بھائی کو یہاں پہنچا تھا، اس سے ایک دن قبل آپی ایسی ڈسٹم بکم ہوئیں گویا انہیں معلوم ہی نہیں، کون آرہا ہے۔ کب آرہا ہے اور کس سے ملنے آرہا ہے!

مجھے آپی کے اس بُلی پنے پر بڑا غصہ آیا لیکن کرچکھ نہ سکی۔ بس بھائی کا انتظار کرتی رہی اور سارے شکوئے ان کی آمد پر اٹھا رکھے۔

جس صحیح انہیں یہاں آنا تھا، آپی کے سوا ہم دونوں گھرانوں کے افراد انہیں لینے کے لیے اشیش پر گئے۔ گاڑی آئی تھیں اس میں انجمن بھائی نہیں تھے۔ ہم سب مایوس ہو کر اپنے گھروں کو لوٹے۔ آپی نے مجھ سے ایک دم بہت سے سوالات کر ڈالے لیکن میں نے ایک کا بھی جواب نہ دیا اور ان سے برتری بن کر تکمیل میں منہ چھپا کر لیٹھی رہی۔ اسی شام خون سے لت پت انجمن بھائی کی لاش ان کے گھر پہنچ گئی۔ تیاگی کا نوکر ہمیں اطلاع کرنے آیا تھا تو اس نے کہا کہ انجمن بھائی ایک دن دلی میں اپنے کسی دوست کے ہاں مقیم رہے۔ دونوں نے موڑ سائیکل پر یہاں پہنچنے کی سکیم تیار کر لی۔ اس باب گاڑی میں بُک کر ادا یا تھا اور وہ دونوں ادھر آنے کے لیے موڑ سائیکل پر روانہ ہو گئے۔ یہاں سے چند میل پرے جر نیلی سڑک پر ان کی موڑ سائیکل اینٹوں سے بھرے ہوئے ایک سڑک کی لپیٹ میں آگئی۔ انجمن بھائی کا دوست تو پہنچ گیا لیکن وہ خود جانبزہ ہو سکے اور سڑک کے کنارے ہی دم دیا۔

یہ خبر سن کر آلامی چھینیں مار مار کر رونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد سوائے ہم دونوں کے بنگلے کا ہر فرد حتیٰ کہ نوکر اور چوکیدار بھی تیاگی کے یہاں پہنچ گئے۔ میں آپی کے پاؤں میں بیٹھی خاموشی سے آنسو بھاتی جاتی تھی۔ آپی بڑے ہی حسین جسم کی طرح کرسی میں بیٹھی تھیں۔ کبھی کبھی میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتیں۔ پھر دیوار کو گھورنے لگتیں۔

کافی رات گزر گئی۔ چاند نکلا۔ آپی آہستہ سے اٹھیں اور میری کلائی پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولیں۔ ”چلو پھول چنیں۔ انجی کو کلیوں اور کرنوں سے بڑا پیار تھا۔ اسے یہ دونوں چیزیں اتنی اچھی لگتی تھیں کہ کبھی کبھی وہ ان کے شوق میں دیوانہ سا ہو جاتا تھا۔ پر میں نے اس کے کرنے میں نہ تو کبھی کلیوں کا ذہیر دیکھا تھا اور نہ کرنوں کی آمد و رفت کے لیے کوئی درپیچہ۔ انجی آ جاتا تو ہم تینوں مل کر کلیاں چننے جاتے تھیں لیکن وہ نہیں آ سکتا تو ہم دونوں ہی یہ کام کریں گی۔“ آپی بے خیالی میں پتہ نہیں کیا کچھ کہے جاتی تھیں۔ پھر وہ آہستہ قدم اٹھاتی ریڈنگ روم سے دونوں ٹوکریاں اٹھالا میں اور ہم

دونوں باغیچے میں نکل کر کلیاں چنے لگیں۔

بالکل ایسی ہی چاندرات کو انہی پیروں میں سے میں نے کتنی ہی کلیاں توڑی تھیں۔ ساری رات آپی کے ساتھ بیٹھ کر لمبی لمبی لڑیاں گوندھی تھیں۔ بار بار اٹھ کر ان پر ٹھنڈے پانی کے چھینے دیئے تھے اور پھر ان لڑیوں کو ایک ساتھ ناٹک کر کتنی ہی لمبی چوڑی چادر تیار کر کے بڑے سیلیتے سے ٹوکری میں بند کیا تھا۔ اگلے دن صبح ہی صبح میں اور آپی چوکیدار کے ساتھ قبرستان گئیں اور ہم دونوں نے کلیوں کی وہ چادر جو چاندنی کی کرنوں تلے بیٹھ کر گوندھی تھی، انجمن بھائی کی قبر پر ڈال دی۔ آپی ایسی ٹھکھور تھیں کہ انہیں بھائی کی قبر دیکھ کر بھی رونانہ آیا۔ مجھے اپنے ساتھ چھٹا کر یہ ہی کہتی رہیں۔ تجھے پنسلیں ہی ترشوانی ہیں نا، میں تراش دیا کروں گی۔ ویسی ہی صفائی سے، ویسی ہی نفاست کے ساتھ!

اس وقت کیسی اجلی چاندنی پھیلی ہے، کتنے پیارے پھول ہیں اور کیسا الہتا مہکتا گیت ہے کہ اب انیل کی طرح اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔ یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس وقت میں اکیلی ہی پھول چنے کے لیے آئی ہوں اور جب ٹوکری بھر کر اندر لوٹوں گی تو اکیدے ہی بیٹھ کر انہیں گوندھوں گی۔ کل جب آپی کی برات آئے گی اور دو لہا بھیا کو اندر بلایا جائے گا تو میں خوشبوؤں کے تاجر کے گلے میں ڈھیر سارے پھولوں کے ہار ڈال کر کہوں گی۔ ”مصنوعی خوشبوئیں امپورٹ کرنے والے بھتیا، ذرا ان کی نکہت بھی دیکھو۔“ لیکن پتہ نہیں آج ان کلیوں کی خوشبو اور رنگ مصنوعی سا ہو کر کیوں رہ گیا۔ جیسے انہیں پڑوں میں نکھارا گیا ہو۔

اندر نو کر انیاں ڈھولک پر گیت گا رہی ہیں۔

و گدی اے راوی ماہی وے وچ اک پھل کائی دا ڈھولا

میں نہ جنم دی ماہی وے توں کی کرو یائی دا ڈھولا

اور ڈھولک ایسے نج رہی ہے جیسے دور بہت دور سنان سڑکوں پر کوئی ہو لے

ہو لے موڑ سائکل پر گھوم رہا ہو۔

برکھا

جب وقت ایسا آگیا کہ فیل پاسے دھوپ کا چٹانخ اچک کر کونے میں ایستادہ حقے کی چلم پر نیک گیا تو شریانے آنکھیں کھول دیں۔ مسلسل کئی گھنٹوں سے وہ قالین پر بے ہوش سوتی رہی تھی اور اب جب دھوپ کے چٹانخ نے اس کے پاؤں میں تباہ مچیں بھر دی تھیں اور وہ جا گئے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کھانا کھانے اور آم چونے کے بعد جب وہ قالین پر آکر لیٹی تھی تو تیز دھوپ کا یہ دھیلے والا پینگ ڈسک کے نیچے پڑا تھا مگر شریان اس کی طرف دھیان دیئے بغیر تکیہ دہرا کر کے فیل پا پر لیٹ گئی تھی۔ میٹھے میٹھے آموں کے گاڑھے گاڑھے بوجھل رس نے جب اس کی آنکھوں میں نیند کی جادو بھری سلانیاں پھیر دیں تو یہ پینگ (تکل) ڈسک تلے سے پھسل کر اس کی ران سے جا چھٹی تھی۔ نیند کی حالت میں صوفے کی طرف کروٹ بدل کر شریانے اس ورق کو پھر قالین پر چھوڑ دیا تھا اور خود خوابوں کی وادیوں میں تیرتی چلی گئی تھی۔ برآمدے کے کلاک نے کچھ بجا لیا تو یہ آفتابی پینگ بھی سرکاری لفافہ سا بن کر قالین پر شریانی کی طرف اور ریگ گیا۔ اس نے سوتے میں جھلا کر دونوں ٹانگیں اٹھا کر صوفے پر ڈال دیں تو لفافہ ڈاث کے نیچے پڑا رہ گیا۔ نیند میں خدا جانے کب اور کیسے اس کا پاؤں گدے سے اٹھ کر صوفے کے بازو پر چلا گیا جو کرنوں سے اس ریگماں کی پکڑ میں آگیا۔ شریانی کی نیند تو کھل گئی مگر اس نے پاؤں وہاں سے اٹھایا نہیں۔ ویسے ہی لیٹے لیٹے جعفری کی طرف دیکھا اور مانوبلی کی سی ایک جمالی لی۔ بنیائیں کی ڈوری کندھے سے پھسل کر عین وہاں آنکی تھی جہاں درمیانی کا نشان ہوتا ہے۔ اس کا کلیجہ گویا منہ کو آرہا تھا اور اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ یو نہیں لیٹے لیٹے شریانے ایک مرتبہ پھر جعفری کی طرف دیکھا۔ اس کی کھڑکی کے نچلے چوکھے پر